بین الافغان مذاکرات

ڈاکٹر محمد اقبال خلیل ○

جب ۲۹ فروری ۲۰۲۰ء کو دوحہ میں امریکا اور افغان طالبان کے درمیان معاہدۂ امن پر دستخط کیے گئے، اس تقریب کی خاص بات امریکا کا طالبان کو برابر کی قوت تسلیم کرنا تھا۔ اس معاہدۂ امن میں بعض ناقابلِ فہم تاریخیں دی گئی تھیں، مثلاً ''۱۰ مارچ کو بین الافغان مذاکرات کا آغاز ہوجائے گا اور اس سے پہلے ۵ ہزار طالبان قیدی اور ایک ہزار سرکاری قیدی رہا کر دیے جائیں گے''۔ اسی طرح دیگر تاریخوں میں ۲۹ مئی اور ۲۷/اگست بھی شامل تھیں، جو سب کی سب گزر چکی ہیں۔ طالبان پر سے بین الاقوامی پابندیاں ہٹانے کی تاریخ بھی گزر گئی، مگر یہ تمام مسائل حل نہ ہوئے لیکن ۱۲ ستمبر کو بین الافغان مذاکرات کا آغاز ضرور ہوگیا۔ ان مذاکرات کا بنیادی ایجنڈا شورش زدہ افغانستان میں امن کا قیام ہے، جو گذشتہ چار عشروں سے بدامنی کا شکار ہے، اور وہاں کا ہر شہری ہر صبح اس تمنا اور دُعا کے ساتھ بیدار ہوتا ہے کہ اس کے وطن میں امن کا سورج آج طلوع ہوگا۔

بنیادی طور پر مذاکرات میں دو گروہوں کا آمنا سامنا ہے۔ لیکن اگر ان گروہوں کی مذاکراتی ٹیموں کا جائزہ لیا جائے تو پوری افغان ملت کی نمایندگی موجود ہے۔ طالبان کے وفد میں کُل ارکان کی تعداد ۲۰ ہے، لیکن کوئی خاتون رکن شامل نہیں، جب کہ افغان حکومت کے وفد میں پانچ خواتین سمیت ارکان کی تعداد بھی ۲۰ ہے۔ حکمت یار کے داماد ڈاکٹر غیرت بہیر کو بھی سرکاری وفد میں شمولیت کی دعوت دی گئی تھی، لیکن انھوں نے معذرت کر لی تھی۔ افغان اعلیٰ امن کمیٹی کے سربراہ ڈاکٹر عبداللہ عبداللہ نے بھی ۱۲ ستمبر کی افتتاحی تقریب میں شرکت کی تھی لیکن وہ خود مذاکراتی وفد

○ پشاور

میں شامل نہیں۔ افغانستان کی سیاست پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں، کہ برسرِ زمین طالبان کے مقابل اصل کرتا دھرتا وہی ہیں۔ صدارتی انتخابات میں شکست کے بعد ڈاکٹر عبداللہ عبداللہ خودساختہ صدر جمہوریہ بن گئے، لیکن بعد میں امریکی دباؤ پر انھوں نے امن کمیٹی کی صدارت قبول کی، جو ایک اعزازی عہدہ ہے۔ البتہ یہ طے شدہ امر ہے کہ اگر بین الافغان مذاکرات ناکام ہوتے ہیں اور افغان دھڑوں میں جنگ چھڑتی ہے، تو طالبان کا مقابلہ سابقہ شمالی اتحاد کی قوتوں کے ساتھ ہی ہوگا۔

بین الافغان امن مذاکرات کا ایجنڈا تو طالبان امریکا معاہدہ ہی میں طے کر دیا گیا تھا۔ دفعہ نمبر ۴ میں تحریر ہے: ''مستقل اور جامع فائر بندی' بین الافغان مذاکرات اور صلاح کاروں کا ایک بنیادی نکتہ ہوگا۔ شرکا مستقل اور جامع فائر بندی کی تاریخ اور طریقۂ کار پر بحث کریں گے، جس میں مشترکہ نظام کے نفاذ کا اعلان اور افغانستان میں مستقبل کا سیاسی نقشۂ کار شامل ہیں''۔ آگے چل کر معاہدے کے تیسرے حصّے کی شق نمبر ۳ میں بات واضح کی گئی ہے کہ ''ریاست ہاے متحدہ (امریکا) نئی افغان اسلامی حکومت جو بین الافغان مذاکرات اور تصفیہ کے بعد وجود میں آئے گی، اس کے ساتھ مالی تعاون جاری رکھے گا، اور اس کے اندرونی معاملات میں دخل انداز نہیں ہوگا''۔

لیکن اس شق سے پہلے شق نمبر ۲ بھی اہم ہے، جس میں کہا گیا ہے: ''ریاست ہاے متحدہ (امریکا) اور امارت اسلامی افغانستان آپس میں مثبت تعلقات قائم کریں گے اور چاہیں گے کہ ریاست ہاے متحدہ اور امارت اسلامی افغانستان باہم معاملات طے کرنے کے بعد بننے والی افغان اسلامی حکومت کے تعلقات اور بین الاقوامی مذاکرات کے نتائج مثبت ہوں گے''۔ یعنی مذاکرات سے پہلے ہی اس کے مثبت نتائج اور نئی افغان حکومت کے قیام کا اعلان ۲۹ فروری ہی کو کر دیا گیا تھا، تو سوال پیدا ہوتا ہے پھر مذاکرات کس موضوع پر ہو رہے ہیں اور مذاکرات کاروں کے ذمے کیا ایجنڈا ہے؟ فائر بندی اور نئی حکومت کا ڈھانچا کیا ہوگا؟ اگر اس ترتیب کو بدل دیا جائے، تو پہلے بات چیت آیندہ حکومتی ہیئت پر ہی ہوگی۔ اور اس کو طے کرنے کے بعد فائر بندی کی نوبت آئے گی۔ ظاہر ہے حکومتی وفد کا مطالبہ تو یہ ہوگا اور ہے کہ پہلے جنگ بندی کر دی جائے۔ ڈاکٹر عبداللہ عبداللہ نے اپنی افتتاحی تقریر میں اسی نکتے پر زور دیا۔ اگرچہ مذاکرات کے تیسرے ہی دن ننگرھار صوبے میں سرکاری فوجی اور طالبان جنگجوؤں کے درمیان لڑائی چھڑ گئی، اور اس میں درجنوں انسانی جانوں کا

نقصان ہوا۔ پہلے حملے کا الزام دونوں طرف سے لگایا گیا۔

طالبان کی جانب سے مذاکرات کا آغاز مستقبل کے حکومتی نظام کے بارے تجاویز سے کیا گیا۔ افغان طالبان کی یہ سوچی سمجھی رائے تھی کہ چونکہ امریکا نے افغانستان پر جارحیت کر کے ان سے حکومت چھینی تھی اور گذشتہ دو عشروں سے امریکی قبضے کے خلاف مزاحمتی جنگ بھی انھوں نے لڑی ہے، اس لیے مذاکرات بھی ان سے کیے جائیں اور حکومت بھی ان کے حوالے کی جائے۔ صدر ٹرمپ نے (بادل نخواستہ) بالآخر ان کے ان دونوں مطالبات کو تسلیم کیا۔ ان سے دو سال مذاکرات کر کے ان کے ساتھ تمام معاملات طے کیے، اور اس کو ایک باقاعدہ معاہدے کے تحت دستخط کر کے اپنے آپ کو پابند کیا۔ البتہ دوسرے مطالبے کے لیے بین الافغان مذاکرات کا مرحلہ طے کیا گیا جس سے گزر کر افغانستان میں امارتِ اسلامی قائم ہوجائے گی۔

اس پورے عرصے میں طالبان کے بارے میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ ایک سخت گیر، بے لچک اور متشدد گروہ ہے، جو صرف جنگ کی زبان جانتا ہے، لیکن امریکی نمایندے زلمے خلیل زادے کے ساتھ مذاکرات میں مُلّا عبدالغنی برادر کی سربراہی میں طالبان تحریک کی قیادت نے ثابت کیا، کہ وہ جس طرح جنگی رُموز سے بخوبی آگاہ ہیں اسی طرح سفارتی اُمور بھی جانتے ہیں۔ مخالف فریقوں کے درمیان مذاکرات میں اصل بات دونوں طرف کے مفادات کا تحفظ، اس کا ادراک اور متبادل تجاویز پیش کرنا ہوتا ہے۔ اس فن کا مظاہرہ انھوں نے امریکا کے ساتھ مذاکرات میں بھی کیا اور افغان دھڑوں کے ساتھ گفتگو کے آغاز میں بھی کیا۔ شنید یہ ہے کہ انھوں نے اپنی حکومت بنانے کا مطالبہ نہیں کیا بلکہ یہ کہا کہ امارت اسلامی کی صدارت/ امارت ایک غیر جانب دار فرد کے سپرد کی جائے جو دونوں فریقوں کو قابلِ قبول ہو۔ البتہ ان کا دوسرا مطالبہ یہ ہے کہ وزارتِ دفاع سمیت پانچ اہم وزارتیں ان کے سپرد کی جائیں۔ بہرکیف طالبان آیندہ حکومت میں اپنی مضبوط پوزیشن دیکھنا چاہتے ہیں اور یہ ان کا حق ہے۔

طالبان کے مدِمقابل ڈاکٹر اشرف غنی افغانستان میں قوم پرست پختونوں، سیکولر عناصر اور سابقہ کمیونسٹوں کی نمایندگی کرتے ہیں۔ ان کی صدارت کا دوسرا دور گزر رہا ہے۔ ایک ماہر معیشت کی حیثیت سے انھوں نے افغان عوام سے جو وعدے کیے تھے، وہ پورے نہیں ہوئے۔ اگر وہ

تاریخ میں اپنا نام اچھے الفاظ سے یاد رکھنا چاہتے ہیں تو انھیں اس موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

افغان طالبان کے مُلّا عبدالغنی برادر کو بھی مذاکرات کو کامیاب بنانے کا چیلنج درپیش ہے۔ پوری افغان قوم اس کامیابی کے لیے دعا گو اور پُراُمید ہے۔ اس موقع پر جنوبی افریقہ کے رہنما نیلسن منڈیلا کی مثال پیش نظر رہے۔ انھوں نے جب ۲۷ سالہ قید سے رہائی کے بعد ملک میں افریقن نیشنل کانگریس کی حکومت قائم کی تو مقامی لوگوں میں سفید فام اقلیت کے خلاف نفرت اپنے عروج پر تھی اور انتقام کا جذبہ عام تھا۔ لیکن نیلسن منڈیلا نے اعلان کیا کہ ہمیں اپنے وطن کو آباد کرنا ہے، اور اس کے لیے ہمیں سفید فام لوگوں کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی مقامی لوگوں کی۔ یوں انھوں نے تمام مظالم کو بھلا کر ایک ترقی یافتہ ملک کی بنیاد رکھی۔ مُلّا عبدالغنی برادر نے خودمختار اور مضبوط اسلامی ملک بنانے کا ارادہ ظاہر کیا ہے، اور پوری دنیا کے مسلمان اس ارادے کی تکمیل میں ان کے لیے دعا گو ہیں۔ مذاکرات کا یہ عمل طویل، صبرآزما اور پیچیدہ ہوسکتا ہے۔ طالبان کو اس میں قدرے بہتر حیثیت حاصل ہے اور وہ پُراعتماد بھی ہیں۔